تانیثیت پسندی اور آزادی سے قبل اردو ناول

عبدالعزیز ملک

Abstract:

Today, the Feminist consciousness emerging as a spirit of the age has become as a global trend. It has now become a school-of-thought popular among the writers of modern sensibility. The whole movement of feminism, feminist theory and criticism has been the rediscovery of a hidden tradition of women's writing and the rediscovery of a number of novels and other works by women. Like other parts of the world, educated women in the sub-continent are also fully aware of their rights and the problems faced by them. Urdu literature is becoming richer by women's writings and enjoys a certain amount of freedom of expression in this segregated society. The history of Urdu novel relating to women's writing is not a recent phenomenon. But unfortunately, the male politics as present in Urdu circles kept this view suppressed for a long time. In this article humble effort is done to find out the feminist elements in Urdu novel before division of India.

اردو میں تانیثی تنقید کا زمانہ بیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی ہے۔ یہ وہی دور ہے جب بین الاقوامی سطح پر ساختیات، نئی مارکسی تھیوری اور مابعد جدید تنقید ایک حاوی ڈسکورس کے طور پر موجود تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تانیثی تنقید نے مذکورہ تھیوریوں سے اثرات بھی قبول کیے اور ان کے خلاف ردِعمل بھی ظاہر کیا۔ مگر متعدد اصطلاحات جدید تنقیدی تھیوری سے ہی اخذ کیں۔ اگر غور کیا جائے تو مابعد جدید دور اور تانیثی تنقید میں اختلافات کے ساتھ ساتھ اشتراکات بھی موجود ہیں مثلاً جس طرح مابعد جدیدیت لامرکزیت کی قائل ہے اسی طرح تانیثی تنقید مردانہ فکر اور مرد کی مرکزی سماجی حیثیت کے خلاف ہے۔ مابعد جدیدیت میں آفاقیت کی بجائے مقامیت پر زور دیا

جاتا ہے،اسی طرح تانیثی تنقید بھی تاریخی ، سماجی ،ثقافتی اور ادبی اُصولوں کی آفاقیت پہ سوالیہ نشان (؟)لگاتی ہے۔

حقیقت میں تانیثیت پسندی عورت کے شعورِ ذات کی پیداوار ہے۔اس مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والوں کے لاشعور میں یہ بات راسخ ہے کہ عورت کو تاریخ اور تاریخی عمل سے باہر رکھا گیا ہے ،اگر باہر نہیں رکھا گیا تو حاشیے پہ ہی جگہ دی گئی ہے۔اُن کے خیال میں عورت کبھی بھی تاریخی عمل کے مرکزی دھارے کا حصہ نہیں رہی۔اب تک عورت کے بارے میں جو ادب تخلیق کیا گیا ہے وہ عورت کے تجربے ، اس کے تجزیۂ ذات اور روح سے نہیں اُبھرا بلکہ وہ مرد کی عورت سے متعلق خواہشات کا مظہر ہے۔ایسا ہرگز نہیں کہ عورت اپنی ذات کے تجزیہ کی صلاحیت سے محروم تھی بلکہ اسے مردمرکز معاشرے نے موقع ہی نہیں دیا کہ وہ اپنی ذات کا تجزیہ کر کے اسے تخلیقی صورت میں سامنے لا سکے۔متعدد لسانی ،مذہبی،معاشی اور تہذیبی عوامل عورت کے شعورِ ذات کے اظہار میں رکاوٹ رہے ہیں۔ ان عوامل پہ حقیقی گرفت ہمیشہ مرد کی رہی ہے۔

اس مضمون میں اردو ناول میں تانیثی عناصر کو زیرِ بحث لایا جائے گا۔جس کو واضح کرنے کے لیے مضمون کو درج ذیل حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ تانیثیت کا تاریخی وتہذیبی پس منظر

۲۔ تانیثیت کی بین الاقوامی تحریک

۳۔ اردو ناول میں تانیثی عناصر

ا۔تانیثیت کا تاریخی وتہذیبی پس منظر:

آج کے اس ترقی یافتہ دور میں انسان جس مقام پہ کھڑا ہے، اس کے پیچھے معاشی ، سیاسی، ذہنی اور تہذیبی جدوجہد کی ایک طویل کہانی موجود ہے۔انسان اس دھرتی پہ کم وبیش ہزاروں سالوں سے آباد ہے۔علمائے تاریخ نے انسانی تہذیب کی اس تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔پتھر کا دور،کانسی کا دور اور پھر لوہے کا دور۔تاریخ کے اس دورانیے میں کئی قومیں اور تہذیبیں وجود میں آئیں اور فنا ہوئیں۔عورت کے حقوق اور اس کے حقیقی تصور کے حوالے سے اگر ان تہذیبوں کا مطالعہ کیا جائے تو عورت کا سب سے پہلا تصور ایک دیوی کے روپ میں ابھرتا ہے، جو کہیں ناہید ، زہرہ اور وینس کی شکل میں موجود ہے تو کہیں عشتار کے روپ میں سامنے آتی ہے۔آج انسان ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے سائنسی دور میں داخل ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے عقائد اور رسوم میں پرانے دور کے خیالات کی بازگشت پھر بھی سنائی دیتی ہے۔ابنِ حنیف اس بارے میں تحریر کرتے ہیں ۔

> ’’سات ہزار سال پہلے سومیریوں کے سیلابِ عظیم کی بابلی روایت ہو یا زہرہ ومشتری طوائفوں کا اپنے حسن وصورت سے فرشتوں کا ایمان متزلزل کر کے آسمان پہ چلے جانے کی پُر لطف حکایت، مادری تہذیب کی علمبردار قدیم زراعت کاروں کا مذہب ہو یا موجودہ عیسائیت اور ہندوازم ،عشتار کسی نہ کسی روپ میں ہرجگہ جلوہ گر ہے۔‘‘(۱)

عورت کا یہ تصور متنوع تہذیبوں میں مختلف ناموں سے مقبول رہا ہے۔مصر کی تہذیب میں یہ 'آئسس' کے نام سے جانی جاتی تھی۔آریہ اسے 'اوشا' سے پکارتے تھے،عراق میں اسے 'عشتار' کہتے تھے۔چین میں اس کی 'شین شین' کے نام سے عبادت ہوتی تھی۔ایران میں یہ اناہتا کہلاتی تھی۔ہندوستان میں یہ درگا، کالی ماتا، پاربتی اور امبا دیوی کے ناموں سے یاد کی جاتی رہی ہے۔یونان میں وینس، ایفروڈیٹی اور ڈیانا کے نام سے معروف رہی ہے۔

جب تہذیب ارتقا کے عمل سے گزری اور مادرسری نظام کی جگہ پدرسری نظام نے لے لی تو اس کا رتبہ کم ہو گیا اور ہر طرح کی برائی اس سے منسوب کی جانے لگی۔عورت کو جانوروں سے تشبیہ دی گئی۔مثلاً وہ لڑکی جسے ورغلایا جا سکے، وہ ہرن کی مانند ہے۔خوب صورت عورت گھوڑے جیسی ہے۔اسی طرح طوائف کو بیل کیا گیا۔دوسرے الفاظ میں یہ باور کروانے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت بذاتِ خود کچھ نہیں ہے اس کی صفات کسی دوسری ہستی سے اجاگر ہوتی ہیں۔یونانی معاشرے میں عورت کی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ نہ تو اس دور میں اسے سیاسی حقوق حاصل تھے اور نہ اسے ووٹ دینے کا حق حاصل تھا۔معروف یونانی مؤرخ پلوٹارک کا خیال تھا کہ عورت کا نام اور اس کا جسم گھر میں قید رہنا چاہیے۔

گزشتہ ادوار میں گھریلو خواتین پر سختی تھی اور انھیں پردے میں رکھا جاتا تھا، جب کہ داشتائیں اور طوائفیں آزاد تھیں، جو مردوں کے ساتھ محفلوں میں شرکت کرتیں اور مردوں کے ذوق کی تسکین کرتیں۔ایتھنز میں بھی ہو بہو یہی صورتِ حال تھی جہاں طوائف آزاد جبکہ گھریلو خواتین قید تھیں۔داشتائیں مردوں کو جسمانی اور ذہنی لحاظ سے آسودگی بخشتی تھیں۔

یونانیوں کے بعد روم کی سلطنت کو عروج نصیب ہوا۔یونانیوں کی طرح روم میں بھی عورت اپنی تمام زندگی کسی نہ کسی مرد کے تابع رہتی۔اس پر پابندیاں تھیں لیکن یونانی عورت کی طرح وہ گھر میں قید نہیں تھی۔مولانا مودودی اپنی کتاب ''پردہ'' میں لکھتے ہیں۔

> ''عورتوں اور مردوں کے برسرِ عام اکٹھا غسل کرنے کا رواج بھی اس دور میں عام تھا۔رومی لٹریچر میں فحش اور عریاں مضامین بے تکلف بیان کیے جاتے تھے اور عوام و خاص میں وہی ادب قبول ہوتا تھا جس میں استعارہ و کنایہ کا پردہ نہ رکھا گیا ہو۔''(۲)

رومی، عورت کو انتہائی سستی جنس سمجھتے تھے۔اُن میں یہ رواج نہ تھا کہ وہ عورتوں کو طلاق دیتے پھریں، بلکہ انھیں اگر عورت سے کوئی شکایت ہوتی تو وہ ان کو قتل کر دیتے۔یہودیت اور عیسائیت کے رواج پاتے پاتے عورت سماجی اور تہذیبی طور پر گر چکی تھی۔یہودیت میں عورت کی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بیوی کو یہ ہدایت دی گئی کہ اس کی ہر خواہش اس کے خاوند کے مطابق ہو۔توریت کی تعلیمات کے مطابق شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے بیوی کو طلاق دے سکتا ہے، مگر عورت کو مرد سے علیحدگی کا کوئی حق حاصل نہیں۔یہودی مرد کی یہ دعا ہوتی تھی کہ خدا تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے عورت نہیں بنایا۔یہودیت میں عورت گناہ کی جانب راغب کرنے والی مخلوق سمجھی جاتی تھی، اسی لیے یہودیوں میں ایسے فرقے بھی ملتے ہیں جو عورتوں سے دور رہتے تھے اور ان کی

آبادیاں مردوں کے لیے مخصوص تھیں ۔

ہندوستانی تہذیب کا اگر مطالعہ کیا جائے تو سومیریوں اور مصریوں کی طرح یہاں بھی مادرانہ نظام قائم تھا۔ ہندی اساطیر میں دنیا کو تخلیق کرنے والی ہستی ایک رقاصہ 'پراکرتی' تھی، جسے 'شکتی' دیوی کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔قدیم ہند میں عورت کی سربراہی کا دور تنتر مت کہلاتا ہے لیکن جب آریہ ویدک نظام لائے تو کم سن بچیوں سے شادی اور ستی کا نظام عورت راج سے نجات کا ذریعہ بنا۔آریاؤں نے ستی کے لیے انوکھی دلیل پیش کی، ان کے خیال میں ہر چیز کا کوئی آقا اور مالک ہوتا ہے ۔اسی لیے عورت کا بھی ایک آقا ہے جو مرد ہی ہوسکتا ہے، لیکن جس غلام کا کوئی آقا نہ رہے اس کو جن اور چڑیلیں چمٹ جاتی ہیں، اس لیے بیوہ عورت کو جلا دیا جانا چاہیے ۔

قدیم تاریخ کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ ہند کی قدیم قوم دراوڑ ہیں ۔ان کے ہاں عورت کو قدر و منزلت حاصل تھی ۔آریاؤں نے یہاں قابض ہونے کے بعد دراوڑ عورتوں سے شادیاں کیں ۔اس سے ہند میں ایک نئی تہذیب کی بنیاد پڑی ۔اس نئے سماج میں عورت کا وہ درجہ کم ہوگیا جو دراوڑوں کے ہاں تھا۔مرد طاقت ور ہوگیا ۔اس نے کم سن لڑکیوں سے شادیاں کر کے اور ستی کی رسم کو رواج دے کر اپنا بدلا چکایا۔دوسری جانب مندروں نے دیوداسی نظام کو تقویت بخشی ۔پروہتوں نے عورت کی تذلیل کے لیے مختلف پران گھڑے اور عورت کی تذلیل کے لیے شاستروں کی غلط تشریح کی ۔ہندوؤں کی مقدس کتاب ''رگ وید'' اور ''منوسمرتی'' میں کہیں ستی کا حکم موجود نہیں ۔جس کا ذکر ڈاکٹر مبارک علی نے ان الفاظ میں کیا ہے ۔

> ''ستی کی پہلی یادگار ۵۱۰ء میں مدھیا پردیش کے شہر اران میں ملتی ہے ۔ستی کی رسم کے پس منظر میں عورت کی سماجی حیثیت ابھر کر آتی ہے کہ آہستہ آہستہ اب اس کی اپنی ذات اور اس کی شناخت ختم ہوتی جاتی ہے اور وہ مکمل طور پر مرد کی ملکیت ہو جاتی ہے ۔اس لیے شوہر کی وفات کے بعد اس کے لیے زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں رہتا ہے ۔''(۳)

رگ وید اور منوسمرتی کے بعد جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مرد کا اثر و رسوخ معاشرے میں بڑھتا گیا اور بعد میں آنے والی مذہبی کتب میں عورت کی تذلیل میں اضافہ ہوتا گیا ۔اس کے بعد عورت کے لیے سخت رویے کی جتنی تاکید ہندو کتب میں موجود ہے اتنی دنیا کے کسی مذہب میں موجود نہیں ۔

عیسائیت میں دیکھا جائے تو پادریوں نے عورت کی پسماندگی کو بڑھانے میں خاصا بڑا کردار ادا کیا ۔انہوں نے عورت کے کردار کو سطحی، کمزور اور دماغی طور پر اسے غیر مستقل مزاج قرار دیا ۔انھوں نے عورت کو ہر قسم کی مجلس سے دور رکھنے کی کوشش کی ۔ان کے خیال میں سماجی اور ثقافتی مواقع اسے آزاد خیال اور بے حیا بنانے میں مدد دیتے ہیں ۔پادری یہ باور کرواتے رہے کہ عورت گناہ، خرابی اور تمام برائیوں کا سبب ہے ۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عورت اور مرد کے تعلق کو ناپاک قرار دے دیا گیا ۔اس سے رہبانیت کو فروغ ملا اور عورت ہر قسم کی مذہبی رسوم سے خارج کر دی گئی ۔پادری یہی سمجھتے رہے کہ عورت ناگزیر شر ہے ۔اس کو دیکھنے سے گناہ کا خیال پیدا ہوتا ہے ۔مرد کو ہر صورت عورت سے بچنا چاہیے ۔مسیحیت میں عورت کا جو تصور موجود ہے اس کو سید شرافت حسین شفقت نے ان

الفاظ میں بیان کیا ہے۔

''مسیحی ادوار میں ایک عام عورت کی کوئی حیثیت نہ تھی بلکہ وہ لونڈی سے بھی بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور تھی۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں جادو اور سحر کے الزام میں الیگزینڈر ششم نے ۱۴۴۰ء میں، لوئی دہم نے ۱۵۲۱ء میں، اوڈرین ششم اور سکاٹ لینڈ میں جیمس ششم نے بے دریغ عورتوں کو جادو اور سحر کے الزام میں پھانسی، گلوٹین اور نذرِ آتش کیا۔ یورپ میں عورتوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے پانی کا ٹب بھی ایک طویل مدت تک رائج رہا۔''(۴)

ان مشکلات کے باوجود عورتیں مختلف انداز سے ان پابندیوں سے بچتی رہیں۔ مرد قوانین کے شکنجے عورتوں پر تنگ کرتے اور عورتیں کسی نہ کسی طرح ان شکنجوں کو ڈھیلا کر لیتیں۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں انسان دوستی کی تحریک نے یورپ میں زور پکڑا لیکن وہ بھی عورت کو جائز مقام نہ دلا سکی۔ صنعتی اور سائنسی دور کے آنے تک عورت کی یہ حالت یورپ میں بدستور قائم رہی۔

اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو اسلام نے عورت کو وہ مقام دیا جو آج کی ترقی یافتہ اقوام میں لمحۂ موجود تک عورت کو نہیں دیا گیا۔ عورت کو طلاق کا حق دیا گیا۔ بیوہ کو دوسری شادی کی اجازت دی گئی۔ تعلیم اور روزگار میں عورت کو مساوی درجہ دیا گیا۔ اسلام سے پہلے مختلف مذاہب اور تہذیبوں کی طرف سے جو اندازِ فکر سامنے آیا وہ یہ تھا کہ عورت جنت میں داخل نہیں ہو سکتی یا مرد کی مانند خدا کا قرب حاصل نہیں کر سکتی۔ قرآن نے یہ بات واضح کر دی کہ جنت میں دخول کا تعلق جنس سے نہیں ہے اور نہ ہی قیامت میں جزا اور سزا صنف کے عوض ہو گی۔ جنت میں داخلے کا معیار اسلام نے تقویٰ قرار دیا خواہ وہ تقویٰ عورت کا ہو یا مرد کا۔ اسلام میں کسی جگہ یہ درس نہیں دیا گیا کہ عورتوں کو مردوں کے لیے پیدا کیا گیا ہے بلکہ قرآن تو کہتا ہے۔

''ھنّ لباس لّکم وّانتم لباس لّھنّ''

ترجمہ: تم ان کے لیے لباس ہو اور وہ تمہارے لیے لباس ہیں۔ (سورۃ بقرہ)

جسمانی ساخت میں عورت مرد سے مختلف ہے اس لیے اسلام میں اس کے فرائض مردوں سے مختلف ہیں لیکن بنیادی انسانی حقوق میں وہ مردوں سے کم تر نہیں ہے۔ ظہورِ اسلام سے قبل عورت کو نفرت اور تحقیر سے دیکھا جاتا تھا۔ جس کا حوالہ قرآن کی سورۃ النحل میں واضح انداز میں موجود ہے۔ اسلام نے عورت کو باعزت مقام دیا۔ بیٹی کی پرورش کو بخشش کا باعث قرار دیا۔ وراثت میں حصہ دار ٹھہرایا، نان ونفقہ اور حق مہر کے حقوق بھی عورت کو دیے گئے۔ قرآن مجید میں عورتوں کے لیے ایک پوری سورۃ ''سورۃ النسا'' نازل کی گئی جس میں وراثت کے قوانین طے کیے گئے ہیں اور مرد سے کافی مراعات واپس لی گئی ہیں۔

انسانی تمدن کی پوری تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ عورت کا وجود دنیا پر ذلت، شرم اور گناہ کا وجود تھا۔ بیٹی کی پیدائش عیب تصور کی جاتی تھی۔ کئی قوموں میں اس ذلت سے بچنے کے لیے لڑکیوں کو قتل کرنے کا رواج عام تھا۔ اسلام نے اس کی نفی کی اور عورت کو اس کا جائز مقام دلایا۔

۲۔تانیثیت کی بین الاقوامی تحریک:

عورت کی خوب صورتی اور نزاکت سے متاثر ہو کر اس کی شعر و ادب میں تو تعریف کی گئی لیکن اس کی فطری صلاحیتوں کو نظر انداز کیا گیا۔ہر دور اور معاشرے میں اسے دوسرے درجے کا شہری قرار دیا گیا اور اس کے بنیادی حقوق سے اغماض برتا گیا۔یہ وہ حالات ہیں جنھوں نے اس کے اندر اس جذبے کو فروغ دیا کہ وہ اس غیر انسانی سلوک کے خلاف آواز اٹھائے۔یہی وہ عوامل ہیں جو آزادئ نسواں کی تحریک کا سبب بنے۔عورت نے ''شعورِ ذات'' بتدریج اور مرحلہ وار حاصل کیا۔اس کا نقطۂ آغاز انقلابِ فرانس سے ہوا جب عورت نے پہلی بار اپنی آزادی کا مطالبہ کیا۔انقلابِ فرانس کے کچھ ہی عرصے بعد ۱۷۹۲ میں ''میری وولسٹن کرافٹ'' نے A Vindication of the Rights of Women کے نام سے کتاب تحریر کی۔اس کتاب میں اس نے عورتوں کی تعلیم کا مطالبہ واضح انداز میں کیا۔دوسرے الفاظ میں میری وولسٹن کرافٹ عورتوں کو مردوں کی مانند چیزوں کی ماہیت جاننے کا حق دار قرار دے رہی تھی جو اس سے قبل اُسے حاصل نہیں تھا۔اس کتاب کے کافی عرصے بعد ''جان اسٹورٹ مل'' The Subjugation of Women تخلیق کرتا ہے،جس کو لبرل فیمنزم کا نام دیا جا سکتا ہے۔جان اسٹورٹ مل نے بھی عورتوں کی تعلیم پر زور دیتا ہے۔وہ عورت کو تعلیم دے کر ریاست کا مفید شہری بنانا چاہتا ہے۔وہ عورتوں کی تعلیم کی بات اس لیے نہیں کرتا کہ عورت اپنی ذات کا تجزیہ اور تجربہ کرنے کے قابل ہو جائے۔تانیثیت پسند لبرل فیمنزم کے بارے میں خیال کرتے ہیں کہ اس نے عورت کی محدود دنیا میں جو وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی وہ مرد مرکز نظام کی استواری پر مرکوز تھی۔

بیسویں صدی میں تیزی کے ساتھ زندگی کے تمام شعبوں میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔اسی صدی میں نسوانی تحریک میں بھی نمایاں پیش رفت ہوئی۔بیسویں صدی کے آغاز میں عورت کو حقِ رائے دہی ملا۔اسی کے ساتھ اسے انتخابات میں حصہ لینے کا اختیار بھی حاصل ہو گیا۔لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوئی،عورتوں نے اپنی اجتماعی جدوجہد جاری رکھی۔اس تحریک میں تخلیق کاروں نے اپنا بھرپور حصہ ڈالا۔اس حوالے سے ریبیکا ویسٹ اور ورجینیا وولف نے خواتین کو درپیش مسائل اور تعصبات کو ثقافتی اور معاشی سطح پر اجاگر کیا۔۱۹۲۹ میں شائع ہونے والی ورجینیا وولف کی کتاب A Room of One's Own نسوانی تحریک میں کلاسیکی دستاویز تصور کی جاتی ہے۔ڈورتھی رچرڈسن کا ناول Pilgrimage اور سیمون دی بوا کی کتاب The Second Sex نے بھی عورت کی ثقافتی شناخت کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔سیمون دی بوا نے اپنی کتاب میں یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ عورت کی جنس کی ثقافتی تشکیل حقیقت میں مرد کے احساسِ برتری کے ہاتھوں ہوئی ہے۔اس نے اس کتاب میں عورت کی اُس اصل کو دریافت کرنے کی کوشش کی جو مرد معاشرے میں کھو گئی تھی۔بعد میں ''کیٹ ملٹ'' نے Sexual Politics میں سیمون دی بوا کے خیالات کو آگے بڑھایا۔

سیاسی سطح پر بھی اس تحریک میں پیش رفت ہوئی۔۱۹۲۹ میں عورتوں کو عدلیہ میں نمائندگی دی گئی۔جب

مارگریٹ فیلڈ کو عدلیہ میں سب سے بڑی باڈی پریوی کونسل میں جج کے عہدے پر تعینات کر لیا گیا۔ کچھ ہی عرصے بعد عورت کو تاجدارِ برطانیہ کا مشیر بھی مقرر کر لیا گیا۔ ۱۹۶۸ میں امریکہ اور کینیڈا کے دو سو سے زائد نمائندوں نے قومی سطح پر ایک کانفرنس منعقد کی۔ تحریک میں فعالیت پیدا ہوئی تو پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے پیغام ہر طرف پھیل گیا۔ یہ پیغام عورت اور مرد کی صنفی برابری پر مبنی تھا جس کے تحت شادی، گھر بار، بچے اور جنسی مسائل پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نظریاتی سطح پر بھی عورتوں کی جدوجہد میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

برصغیر پاک و ہند میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ عورتوں کی حالت میں تبدیلی رونما ہوئی۔ ۱۹۳۵ کے ایکٹ میں جیسے ہی عورتوں کو ووٹ کا حق ملا ان کی سیاسی اہمیت میں اضافہ ہو گیا۔ مسلم لیگ نے مسلمان عورتوں کو سیاست میں سرگرم ہونے کی ترغیب دی۔ اس سے قبل ہندوستان کی عورت سماجی جبر کا شکار تھی۔ بالائی طبقے کی عورت نے تو اس سے نجات حاصل کر لی تھی لیکن دیہات اور شہر کی غریب عورت اس چکی میں ابھی تک پس رہی تھی۔ یہ عورت سماج کے بندھنوں میں اتنی جکڑی ہوئی تھی کہ بار بار کی کوششوں کے باوجود اس کی سماجی حیثیت میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں خواتین کو خاصی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر کار ۱۹۳۸ میں شریعت قانون منظور کر لیا گیا۔ اس قانون کے تحت مسلمانوں کے لیے کئی معاملات میں قانونِ شریعت کا اطلاق کیا جانے لگا۔ تقسیمِ ہندوستان کے بعد عورتوں کو بعض حقوق قوانین کے تحت مل گئے لیکن بعض حقوق کے لیے انھیں جدوجہد کرنا پڑی۔

عورتوں کے حقوق کی خاطر ''آل پاکستان وومین ایسوسی ایشن'' کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا کام عورتوں کا عمومی شعور اجاگر کرنا تھا۔ اس کے علاوہ بھی پاکستان میں کئی تنظیمیں وجود میں آئیں، جن میں ''پاکستان ہلالِ احمر''، ''فیملی پلاننگ ایسوسی ایشن آف پاکستان''، ''پاکستان نرسز فیڈریشن''، ''ہاؤس وائف ایسوسی ایشن'' اور ''انٹرنیشنل وومین کلب'' خاص طور سے نمایاں ہیں۔ ان تنظیموں نے پاکستان میں عورتوں کے حقوق کی بحالی میں بھرپور کردار ادا کیا۔

نسوانی تحریک کا مقصد عورتوں کے بنیادی حقوق اور برابری کے لیے آواز اٹھانا تھا۔ اس ضمن میں ادیب اور وہ لوگ جو عورتوں کے حقوق کی آواز بلند کرتے ہیں، وہ بھی اس تحریک کا حصہ ہیں۔ متعدد غیر سرکاری تنظیمیں جو مختلف سطحوں پر کام کر رہی ہیں، وہ اس سے سوا ہیں۔

اردو ناول میں تانیثی عناصر:

قصہ یا کہانی کسی بھی قوم کے شعور اور تخیل کے عکاس ہوتے ہیں۔ ان میں اس قوم کے تخیل کی قوتِ پرواز کا عکس ہوتا ہے اور اس آئینے میں وہ ساری چیزیں مشاہدہ کی جا سکتی ہیں جن کی جانب اس قوم کا رجحان ہوتا ہے۔ اردو ادب میں قصے کہانی کا چلن خاصا پرانا ہے۔ لیکن انیسویں صدی میں اس نے نیا رخ اختیار کیا اور ناول کی صنف کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ ۱۸۵۷ سے پہلے تک داستانوں کا دور رہا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب ادب کی سرپرستی درباروں میں ہوا کرتی تھی اور داستانیں بادشاہوں کی فرمائش پر لکھی جاتی تھیں۔

داستانوی ادب کی ابتدا سے لے کر دورِ جدید میں ناول کی صنف متعارف ہونے تک، اس روایت میں عورت کے سارے انگ موجود ہیں۔ داستانیں چونکہ مرد نے مرد کے لیے تخلیق کی تھیں اس لیے جن جذبات کا تعلق مرد کی ہوس پسندی ہوتا، اسے زیادہ تفصیل سے بیان کیا جاتا تھا۔ ہندوستانی تہذیب میں مرد اور عورت کو آپس میں ملنے کی آزادی نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ داستانوں میں عشق کی تسخیر کے ایسے مناظر بیان کیے جاتے تھے جن میں لذت کا بھرپور سامان ہوتا تھا۔

داستانوں میں جہاں عورت کو جنسی علامت کے طور پر پیش کیا گیا وہاں عورت سے ارفع درجے کے کام بھی لیے گئے۔ مثلاً وہ رسم و رواج، مذہب اور قوم پرستی کی محافظ بھی بنی ہے۔ اس کے طعنوں نے جنگوں کے پانسے پلٹ دیے۔ بعض اوقات تو مرد عورت کو متاثر کرنے کے لیے بڑے سے بڑے کارنامے بھی سرانجام دیتے رہے جو دلوں میں جوش و ولولہ پیدا کرتے ہیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ داستانوں میں عورت کے منفی اور مثبت دونوں پہلو سامنے آئے ہیں۔

۱۸۵۷ کے قریب قریب داستانوں کا زمانہ اختتام کو پہنچا اور تخیل کی جگہ حقائق نے لے لی۔ اس دور میں سائنس کی ترقی نے زور پکڑا اور سائنسی سوچ نے قصہ کہنے کے جدید انداز کی آبیاری کی۔ جس کے نتیجے میں ناول کی صنف نے فروغ پایا۔ عجب اتفاق ہے کہ شاعری کی مانند ناول کے سوتے بھی دلی اور لکھنؤ کی دھرتی سے پھوٹے۔ اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کا تعلق دلی سے تھا جب کہ رتن ناتھ سرشار کا تعلق لکھنؤ کی سرزمین سے تھا۔ ان دونوں ناول نگاروں نے ناول کی صنف کو متعارف کروایا اور بعد میں آنے والے ناول نگاروں نے اس کو مزید آگے بڑھایا۔

ڈپٹی نذیر احمد نے ناول کی صنف کو ایسی صحت مند روایت سے روشناس کیا کہ عصرِ حاضر میں بھی اردو ناول نگاری ان سے کسی نہ کسی طور استفادہ کر رہی ہے۔ ان کے ناولوں میں ''مراۃ العروس''، ''بنات النعش''، ''توبۃ النصوح''، ''فسانۂ مبتلا''، ''ابن الوقت''، ''ایامیٰ'' اور ''رویائے صادقہ'' شامل ہیں۔ ان کے ناولوں کی تانیثی جہت کے حوالے سے ڈاکٹر زینت بشیر لکھتی ہیں:

> ''نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار اس عہد کے ہندوستان بالخصوص شمالی ہندوستان کے مسلم متوسط گھرانوں کی مستورات کی نفسیات، ان کے خیالات، نظریات و رجحانات کی منہ بولتی تصویریں اور اس عہد کی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔''(۵)

نذیر احمد کی اصلاحی کوششوں کا بنیادی مقصد متوسط طبقے کی عورتوں کی اصلاح تھا کیوں کی معاشرے کی تعمیر میں عورتوں کی اہمیت کا انھیں بخوبی اندازہ تھا۔ ان کے ناولوں میں جاگیرداری عہد کی عورت کی واضح تصویر ملتی ہے، جسے مرد اپنی ذاتی ملکیت سمجھتا تھا۔ نذیر احمد کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ عورت کے موجودہ مقام کی ذمہ داری مردوں پر عائد ہوتی ہے۔ مردوں نے اسے انفرادیت اور بنیادی حقوق سے محروم کر کے اسے اپنا مطیع بنا لیا ہے جس کے نتیجے میں عورتوں میں تعلیم نہ ہونے کے برابر رہ گئی کیوں کی مردوں کو خدشہ تھا کہ اگر وہ تعلیم یافتہ ہو کر کہیں ان

کی برابری کی دعوے دار نہ بن بیٹھے۔تعلیم کی کمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ خواتین توہم پرست اور ضعیف الاعتقادی کا شکار ہو کر رہ گئیں۔''مراۃ العروس'' کی مزاج دار بہو اس دور کی خواتین کی حقیقی ترجمان ہے۔اس کردار کے ذریعے نذیر احمد نے توہم پرست عورتوں کی ذہنیت کی عکاسی کی ہے اور ناول نگار نے اس کردار کے ذریعے واضح کیا ہے کہ عورتیں ٹونے ٹوٹکے کے چکروں میں پڑ کر کس قدر نقصان اٹھا لیتی ہیں۔مزاج دار بہو ایک چالاک عورت کے دامِ فریب میں پھنس کر اپنا گھر بار لٹوا لیتی ہے۔

نذیر احمد اپنے عہد کی عورتوں میں ایسی صفات دیکھنے کے متمنی ہیں جن پر گھریلو نظام کی درستی کا انحصار ہے۔اس لیے وہ تعلیمِ نسواں کے حامی ہیں۔ان کے خیال کے مطابق عورتوں کی بہترین صلاحیتیں تعلیم کے بغیر مکمل طور پر اُبھر کر سامنے نہیں آ سکتیں۔ان کے ہاں تعلیم صرف مذہبی، اخلاقی اور خانہ داری سے متعلق ہے،اس طرح وہ تعلیمِ نسواں کا محدود تصور رکھتے ہیں۔ان کے اس تصور کے پسِ پشت ان کی مذہبی اخلاقیات ہے۔وہ عورت کے حقوق کی بات کرتے ہیں لیکن اتنی جتنی کہ مذہب اجازت دیتا ہے۔اس حوالے سے فہمیدہ کبیر کا کہنا ہے۔

> ''عورت کا سب سے بڑا فرض ان کے نزدیک گھر داری ہے، جس کے لیے وہ تعلیم کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔لیکن یہ تعلیم گھر کے اندر ہونی چاہیے،مغربی تعلیم نہیں، جس کے لیے پردے سے باہر آنا ضروری تھا۔نذیر احمد اس محدود تعلیم پر اس لیے زور دیتے ہیں کہ اس سے بچوں کی تربیت میں مدد ملتی ہے۔سماجی یا مذہبی حیثیت سے وہ عورت کو مرد کے برابر درجہ دینے کے لیے تیار نہیں۔عورت کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ غیر مشروط طور پر شوہر کی مطیع رہے لیکن عورت کی جس صفت کو وہ سب سے زیادہ سراہتے ہیں وہ ان کی مذہبیت اور دین داری ہے۔''(۶)

نذیر احمد عورت کا بیوہ ہونے کی صورت میں اس کو دوسری شادی کا حق دیتے ہیں لیکن ان کو عورت کا گھر سے باہر آ کر مردوں کے دوش بدوش کام کرنا پسند نہیں۔وہ عورت کی معاشی آزادی کے اس حد تک قائل ہیں کہ وہ گھر میں بیٹھ کر کسی ہنر یا دست کاری کے ذریعے سے اپنا رزق کما سکتی ہے۔ان کے نزدیک عورت کا سب سے اہم فرض اس کی گھر داری کا فریضہ ہے۔یہی بات وہ اپنے ناولوں کے توسط سے قارئین تک پہنچانا چاہتے ہیں۔

نذیر احمد کے بعد اردو ناول میں جو اہم نام ہمارے سامنے آتا ہے وہ رتن ناتھ سرشار کا ہے۔ان کے ناول کرداری ناول ہیں اور نذیر احمد کی طرح وہ اپنے کرداروں کو نیکی اور بدی کا نمائندہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔لیکن ان دونوں ناول نگاروں میں فرق نصب العین کا ہے۔نذیر احمد نے معاشرے کی اصلاح کو مدِنظر رکھا ہے، جب کہ رتن ناتھ سرشار نے اپنے روزگار کو۔بقول ڈاکٹر عتیلہ جاوید ''نذیر احمد روح کی تسکین چاہتے تھے جب کہ سرشار پیٹ کی'' سرشار مسلمانوں کی معاشرت اور تہذیب سے مکمل طور پر نہ سہی لیکن بہت حد تک واقف تھے۔اسی لیے سرشار کے ہاں محلوں کے اندر بیگمات کی زندگی کو پر اثر انداز میں دکھایا گیا ہے۔یہ بیگمات چار دیواری کی پابند ہیں۔رسم و رواج نے ان پر الگ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں،انھیں زندگی میں کبھی کبھار سیر و تفریح کے مواقع میسر آتے

ہیں ،مثلاً شادی کی تقریبات اور تیو ہار وغیرہ کی محافل۔سرشار ان مناظر کو ایک ماہر مصور کی طرح پینٹ کرتے ہیں ۔بیگمات کے کردار گھڑتے ہوئے ان کی وفاداری ،شوہر پرستی، شرافت اور وضع داری کا خاص خیال رکھتے ہیں ۔اس کی واضح مثال ان کے ناول ''سیر کہسار'' کی نواب نادر جہاں بیگم اور'' جامِ سرشار'' میں امین الدین حیدر کی بیوی، جو اپنے شوہر کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے ہر وقت تیار ہوتی ہے۔ان کرداروں کا اگر جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ نوابین کے پست کرداروں کے مقابلے میں عمدہ اخلاقی صفات کی مالک ہیں ۔لیکن ہر کردار تمام لغزشوں سے مبرا نہیں ان کے ناولوں میں ایسے کردار ضرور مل جاتے ہیں جو اخلاقی پستی کا شکار ہوں ۔'' فسانۂ آزاد'' میں ایسی بیگمات موجود ہیں جو شادی سے پہلے دل کھول کر داد عیش دیتی نظر آتی ہیں ۔ثریا بیگم عرف جوگن حسن آرا کی چچا زاد بہن یعنی بمبئی والی بیگم، نازک ادا بیگم عرف آسمان اور جانی بیگم جیسے کرداروں کو اس حوالے سے مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔نوابین کی بیگمات اور نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی خواتین کے علاوہ عورت کے حوالے سے لکھنو میں ایک اور غیر صحت مند ادارہ'' طوائف'' کا رہا ہے ۔اودھ کی تہذیب میں اس کردار کی حیثیت بنیادی رہی ہے۔یہاں وضع داری ،شرافت اور شعر و ادب کے ساتھ ساتھ افیم کی چسکی اور جام کی کھنک تک ہر چیز اپنے تمام تر لوازمات کے ہمراہ موجود ہے ۔سرشار کے ناولوں میں باوقار طوائفوں سے لے کر دیہات کی کسبیوں تک کے کردار بڑی مہارت سے پیش کیے گئے ہیں ۔سرشار کے ناول'' جامِ سرشار'' میں لیلیٰ اور شیریں کے کردار نوابوں کو جس طرح لوٹتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نوابوں کی بے اندازہ دولت سے اس قماش کی خواتین کے لیے کتنا حصہ موجود تھا ۔

سرشار نے عورت کا مثالی کردار بیگمات کے پردے میں پیش کیا ہے جو تعلیم و تربیت، شرافت اور انسانیت کا ارفع نمونہ ہے۔اُن کے مثالی عورت کے کردار ڈپٹی نذیر احمد کے کرداروں کا عکس نظر آتے ہیں ۔ وہ اسی طرح کی عورت کو پسند کرتے ہیں جو اچھی بیوی اور اچھی ماں بن سکے۔ایک ماں بہن اور بیٹی کی حیثیت سے اس پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے نہ صرف اسے اس کا احساس ہو بلکہ وہ اس سے عہدہ برا بھی ہو۔

عبدالحلیم شرر کا شمار ان ناول نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے تاریخی ناول نگاری کی طرح ڈالی ۔شرر کا زمانہ بھی وہی ہے جس دور میں شبلی نعمانی ،نذیر احمد، حالی اور سرشار موجود تھے ۔عبدالحلیم شرر کے ناولوں میں عورت کی جو تصویر کشی کی گئی ہے وہ اُس تصویر سے مختلف نہیں ہے جو سرشار اور رسوا کے ہاں موجود ہے۔انھوں نے اپنے ناولوں میں مختلف طبقوں کی عورتوں کی عکاسی کی ہے۔نچلے طبقے کی عورتوں کے کرداروں سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ شرفا کے اخلاقی زوال کی ذمہ داری کسی حد تک ان پہ بھی عائد ہوتی ہے ۔اس حوالے سے ڈاکٹر عقیلہ جاوید تحریر کرتی ہیں ۔

> ''ان کے ناولوں میں کٹنیاں جن کا کام یہ ہے کہ امرا اور نوابین کی آتشِ ہوس کو بجھانے کے لیے شریف بہو بیٹیوں کو ورغلائیں'' حسن کا ڈاکو'' (۱۹۱۳) میں وزیرن کٹنی اور'' بغداد کی حسینہ'' میں امِ غول، اس قسم کی عورتوں کی نمائندگی کرتی ہیں ۔ گھر کی مامائیں اور خادمائیں شریف

گھرانوں کے راز افشا کرتی ہیں اور سیدھی سادھی عورتوں کو بہلا پھلا سیانوں کے فریب میں مبتلا کرتی ہیں ۔ ''خوفناک محبت'' (۱۹۱۵) میں گلشن ماما اس قسم کی عورت ہے۔ان کے علاوہ مشاطائیں معاشرے کے حق میں کچھ کم خطرناک نہ تھیں ۔'' (۷)

شرر کے ناولوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کی تعلیم کے زبردست حمایتی تھے۔انھوں نے سرشار اور نذیر احمد سے ہٹ کے عورتوں کے لیے جدید تعلیم کے حصول کو بھی لازمی قرار دیا۔مزید براں وہ عورتوں کا مغربی تہذیب سے واقف ہونا بھی برا نہیں سمجھتے تھے۔ان کے خیال میں یہ وقت کا تقاضا تھا جس سے چشم پوشی کرنا مسلمانوں کے حق میں اچھا نہیں تھا۔وہ ان تمام رکاوٹوں کے بھی خلاف تھے جو عورتوں کی جائز آزادی میں حائل تھی۔وہ عورتوں کے پردے کے بھی حق میں نہیں تھے کیوں کہ پردے کی وجہ سے عورتیں آدابِ معاشرت سے ناواقف رہتی ہیں ۔تجربات محدود ہونے سے ان کے خیالات میں وسعت پیدا نہیں ہو پاتی۔شرر دراصل عورت میں بہادری اور شجاعت دیکھنے کے متمنی تھے۔اسی لیے اُنھوں نے اپنے ناولوں میں ایسے کردار پیش کیے جو اُن کے اپنے بنائے ہوئے تصورِ عورت کی عکاسی کرتے ہیں ۔ورجینا، موہنا، انجلینا اور شہزادی بلقان کے کردار جو ملک وقوم کے لیے بڑے بڑے معرکے سرانجام دیتی ہیں۔

مرزا ہادی رُسوا اردو ناول کے ارتقا کا اہم مرحلہ ہیں ۔اُن کے ناول اُردو ناول کی فنی تکمیل کا احساس دلاتے ہیں ۔مرزا ہادی رُسوا نے اپنے سے پہلے ناول نگاروں کی طرح بیگمات کے کردار اس طرح پیش نہیں کیے بلکہ انھوں نے غیر واضح انداز اپنا ہے۔ان کے ہاں بہت کم کردار ایسے ہیں جو لکھنو کی بیگمات کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔'' ذاتِ شریف'' میں نواب کلثوم بیگم کا کردار اور'' امراؤ جان ادا'' میں نواب سلطان کی بیگم کا کردار اس ضمن میں مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں ۔ان بیگمات کے کرداروں کے ذریعے رسوا نے جو لکھنو کا نقشہ کھینچا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی زندگیاں عیش وعشرت میں بسر ہو رہی تھیں ۔دولت اور حکومت کا خمار ان کے سر پر سوار ہے۔وہ جاگیردارنہ دور کی تہذیبی روایات کی پاسدار ہیں ۔ہر لحہ خاندانی تفوق اور سماجی برتری کا احساس اُن کے سر پر سوار رہتا ہے۔نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی عورتوں کے جو کردار مرزا ہادی رسوا نے گھڑے ہیں ان کے تنقیدی جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ اُنھیں اِفلاس اور جہالت نے اخلاقی پستی کی جانب دھکیل دیا ہے، جہاں وہ معاشرے کو برباد ی کے علاوہ کچھ نہیں دے سکتیں ۔اُن کے ہاں مذہب، اخلاق اور شرافت ایسی اَقدار بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں ۔اِس حوالے سے ''اختری بیگم'' میں چھٹی نویس شہزادی اور بوا حسینی اِس قسم کے نمائندہ کردار ہیں ۔رُسوا نے اپنے ناول '' اُمراؤ جان اَدا'' میں خانم کے کوٹھے کے توسط سے لکھنو کی زوال آمادہ تہذیب کے خدوخال کو بڑی خوش اُسلوبی سے نمایاں کیا ہے۔اس دور کی اَخلاقی اَقدار کا کھوکھلا پن خانم کے کوٹھے پر حاضری دینے والے نوابین کے رویوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اُمراؤ جان اَدا میں رُسوا کی ہمدردیاں ''اُمراؤ جان'' اور ''خورشید'' ایسی طوائفوں کے ساتھ جُڑی ہوئی ہیں جو تقدیر کے ستم کا شکار ہوئی ہیں۔ان میں کوئی ایسی بات نہیں، جو رنڈیوں کی پہچان ہوتی ہے۔رُسوا کو تقدیر کی ماری

ہوئی ان عورتوں سے ہمدردی ہے۔

''رسوا: اُمراؤ جان! میری زندگی کا ایک اصول ہے نیک بخت عورت کو میں اپنی ماں بہن کے برابر سمجھتا ہوں۔خواہ وہ کسی قوم وملت کی کیوں نہ ہو اور ایسی حرکتوں سے مجھے سخت صدمہ پہنچتا ہے جو اس کی پارسائی میں خلل انداز ہوں۔ جو لوگ اس کو ورغلاتے یا بدکار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔میری رائے میں قبل گولی مار دینے کے ہیں۔مگر فیاض عورتوں کے فیض سے مستفید ہونا میرے نزدیک کوئی گناہ نہیں ہے۔''(۸)

مختصراً اگر جائزہ لیا جائے تو رسوا کے ناولوں میں عورت کا تصور بڑی حد تک ڈپٹی نذیر احمد کی مثالی عورت کے تصور سے ملتا جلتا ہے۔رسوا کے نسوانی کردار نذیر احمد کی اصغری اور محمودہ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

علامہ راشد الخیری اردو ناول کی راویت میں ایک اہم نام ہیں جنھوں نے ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں سے اچھا خاصا اثر قبول کیا ہے۔راشد الخیری نے بیشتر ناول خواتین کے لیے ہی لکھے ہیں جن میں لڑکیوں کی تعلیم وتربیت اور ان کی سماجی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ان کے ناولوں میں ''صبحِ زندگی''،''شامِ زندگی''،'' سیلابِ اشک''،'' حیاتِ صالحہ'' اور''ماءِ عجم'' کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ان کا مشاہدہ تھا کہ عام طور پر شرفا کے گھروں میں عورتیں جہالت کا شکار ہیں۔راشد کے معاشرے میں یہی سمجھا جاتا تھا کہ تعلیم کسب معاش کا ذریعہ ہے۔چوں کہ مرد معاشی سرگرمیوں میں زیادہ حصہ لیتے ہیں لہٰذا ان ہی کو تعلیم بھی حاصل کرنی چاہیے۔ان کے ناول ''صبحِ زندگی'' میں ایک کردار کا بیان ملاحظہ ہو۔

''لڑکیوں کو پڑھانے لکھانے سے فائدہ کیا؟ان کو کہیں نوکری نہیں کرنی، روٹی نہیں کمانی، سارے جہاں کا حال بتا کر دیدہ دلیر کرنا ہے۔''(۹)

راشد الخیری نے اپنے ناولوں میں عورتوں کی توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی پر کڑی تنقید کی ہے۔توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کی بدولت شریف عورتیں مکار عورتوں کے دامِ فریب میں آجاتی ہیں۔

راشد الخیری عورتوں کی تعلیم کے لیے بھی کوشاں ہیں۔لیکن وہ عورت سے اس بات کی یقین دہانی چاہتے ہیں کہ وہ تعلیم کے حصول کے بعد مشرقی تہذیب کی پابند رہے۔وہ عورت کی مغربی تہذیب کی تقلید کو مستحسن خیال نہیں کرتے۔وہ عورت کی تعلیم کے حوالے سے مغربی تہذیب کی اچھائیوں اور قدیم روایات کے امتزاج کے حق میں ہیں۔ان کے اس خیال کی تصدیق ان کے ناول ''صبحِ زندگی'' کے اس اقتباس سے بھی ہوتی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو۔

''میں نہیں چاہتی کہ لڑکیاں لکیر کی فقیر بنی رہیں۔زمانہ کا رخ دیکھ کر کام کرو۔مگر نہ ایسا کہ دوسری کی ریس میں اپنی اصلیت کو ہی بھول جاؤ''(۱۰)

راشد الخیری کے بعد پریم چند کے دور کا آغاز ہوتا ہے جس میں سیاسی بیداری کی تحریک نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔برہمو سماج اور آریہ سماج کی اصلاحی تحریکوں کی بدولت رواداری اور انسان دوستی کے تصورات تعلیم یافتہ

طبقے میں زور پکڑ رہے تھے۔اس صورتِ حال کے اثرات پریم چند پر بھی پڑے۔عورتوں کی سماجی اصلاح کے حوالے سے پریم چند کے خیالات اور آریہ سماج کے تصورات میں مماثلت تلاش کی جا سکتی ہے۔پریم چند کے عہد میں ہندو عورتوں کے ساتھ روا رکھا جانے والا سلوک کسی طور بھی قابلِ ستایش نہیں خاص طور پر ہندو بیوہ کی دوسری شادی کا مسئلہ۔ پریم چند نے اپنے متعدد ناولوں میں اس مسئلے کو موضوع بنایا ہے۔''ہم خورما و ہم ثواب'' اور ''بیوہ'' اس حوالے سے اہم ناول ہیں،جن میں اس مسئلے کو زیرِ بحث لاتے ہوئے اس کا سماجی حل تلاش کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

پریم چند اپنے ناولوں میں بیواؤں کی دوسری شادی کے مسئلے کو اجاگر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کے خیال میں جب مردوں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ بیوی کی وفات کے بعد شادی کر سکتے ہیں تو عورت کو اس حق سے کیوں محروم رکھا جاتا ہے۔انھوں نے ایک بیوہ سے خود شادی کر کے اس بات کا عملی ثبوت بھی دیا۔مزید وہ ہندو سماج میں بے جوڑ شادیوں کے بھی سخت مخالف ہیں۔اکثر بے جوڑ شادیوں کے پیچھے جہیز کا مسئلہ موجود ہوتا ہے۔اس حوالے سے ان کے ناول ''نرملا'' میں نرملا اور ''بازارِ حسن'' میں سمن کا کردار ایسی ہی صورتِ حال کی نمائندگی کرتے ہوئے مظلوم عورت کی بے بسی کو نمایاں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔پریم چند عورت کی معاشی آزادی اور تعلیم کے حصول کے حق میں بھی آواز بلند کرتے ہیں۔ان کے ناولوں میں عورت کا جو تصور اُبھر کر سامنے آیا ہے وہ قدیم ہندو تہذیب کی اعلیٰ اخلاقی صفات اور مغربی تہذیب کی شائستگی کے امتزاج سے نمایاں ہوتا ہے۔ان کے ناولوں ''گئو دان'' کی گوبندی اور ''بیوہ'' میں پریما،عورت کے اسی تصور کے نمائندہ کردار ہیں۔

پریم چند کے علاوہ اس دور میں قاری سرفراز حسین اور سجاد حسین انجم کے نام بھی نمایاں ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی حوالے سے عورت کے مسائل کو اپنے ناولوں کا حصہ بنایا ہے۔قاری سرفراز حسین نے ''سلسلۃ الملوک'' اور ''اصلاحِ شرفا'' کے نام سے ناولوں کے دو سلسلے شروع کیے جن میں عورتوں کے بیشتر کرداروں کا تعلق طوائفوں سے ہوتا تھا۔ان کے ناول طوائف کی باعزت زندگی کے حصول کے لیے داخلی اور خارجی کشمکش کی کہانی بیان کرتے نظر آتے ہیں۔انھوں نے طوائف کے ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جن میں پیشہ وارانہ زندگی سے تنگ آ کر گھریلو زندگی کی خواہش مخفی ہے۔قاری سرفراز حسین کے برعکس سجاد حسین انجم اور مرزا ہادی رسوا طوائف کو اور نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔

سجاد حسین انجم کے ناول ''نشتر'' میں طوائف کا جو کردار پیش کیا گیا ہے وہ محبت اور وفا کا پیکر دکھائی دیتی ہے۔اس کے باطن میں خیر اور شر کی قوتیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی ہیں۔عورت کی نیکی اس کے بُرے ماحول پر غالب آنے کی سعی کرتی ہے جب کہ ماحول کی برائیاں اس کے سامنے روڑے اٹکاتی رہتی ہیں۔عورت کی نیکی جس انداز سے ماحول سے برسرِ پیکار ہے اس کی نمائندگی سجاد حسین انجم کے ناول میں بڑی خوب صورتی سے ہوئی ہے۔

''یاسمین'' اور ''خوابِ ہستی'' مرزا محمد سعید کے معروف ناول ہیں۔ان کے ناولوں کے مطالعہ سے یہ بات

سامنے آتی ہے کہ وہ عورتوں کی تعلیم کے حامی ہیں لیکن بعض منطقوں میں انھیں خرابیاں بھی نظر آتی ہیں ۔ان کے ناول ''یاسمین'' کا مرکزی کردار مغربی تعلیم یافتہ عورت کی عکاسی کر رہا ہے جو اپنے حسن اور خوب صورتی سے کسی بھی مرد کو قابو میں لا سکتی ہے ۔جب کہ ایک اور کردار صفیہ مشرقی تعلیم سے مزین ہے لیکن چوں کہ اب وہ دور نہیں رہا کہ مرد خاتونِ خانہ سے لطف اندوز ہونے کی بجائے جدت پسند اور شمعِ محفل طرز کی خواتین کو زیادہ پسند کرتے ہیں ۔ صفیہ کا شوہر اس کی اطاعت شعاری کے باوجود اس سے منہ موڑ کر یاسمین سے اپنا تعلق قائم کر لیتا ہے ۔

اگر دیکھا جائے تو حسن اور عشق ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں ۔اردو ناول میں رومانویت پسندوں نے عشق کے ساتھ تصورِ عورت کو لازم قرار دیا اور جب عورت تخیل سے مملو ہو کر اردو ناول کا حصہ بنی تو اس کی ذات سے لطف و مستی کے جذبات بھی وابستہ کر دیے گئے ۔نیاز فتح پوری کے ناول ''شہاب کی سرگزشت'' اور ''شاعر کا انجام'' میں عورت کے کچھ اسی طرز کے روپ سامنے آتے ہیں ۔ان ناولوں میں عورت کا ارضی نہیں بلکہ تخیلی تصور منعکس ہوتا ہے ۔بعض جگہوں پر تو عورت کو اس طرح پیش کیا گیا ہے جیسے عورت صرف جنسی تشفی کے لیے ہے نکاح کرنے کے لیے نہیں ۔''شہاب کی سرگزشت'' میں شہاب یہ کہتا ہے ۔

> ''تم سمجھتے ہو کہ نکاح میں بھی وہی لذت ہے جو اس کے خیال میں ہے ۔کیا تمھیں یقین ہے کہ کسی سے مل جانا ملنے کی آرزو سے زیادہ کہ پر لطف ہے ۔کیا تم واقف نہیں کہ آرزو کا حصول آرزو کی موت ہے ۔''(۱۱)

رومانوی تحریک کے جو رجحانات علامہ نیاز فتح پوری کے ہاں موجود ہیں اس کا عکس کشن پرشاد کول کے ناول ''شاما'' میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے ۔اس ناول میں ہندو سماج میں عورت پر ہونے والے مظالم کو موضوع بنایا گیا ہے ۔اسی عہد میں فیاض علی نے بھی دو ناول تحریر کیے ،جن کے نام ''شمیم'' اور ''انور'' ہیں ۔ان ناولوں میں عورت کا کوئی منفرد پہلو اُبھر کر سامنے نہیں آتا ۔

آزادی سے قبل اردو ناول میں عصمت چغتائی نے تانیثی رجحانات کو پروان چڑھایا ۔اس نے نوجوان لڑکیوں کے احساسات و جذبات کے ایسے منطقوں کو طشت از بام کیا جو کسی مرد کی نہیں بلکہ ایک عورت کے بس کی ہی بات تھی ۔عصمت چوں کہ خود ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی عورت تھی اس لیے اس نے متوسط طبقے کی نوعمر لڑکیوں کے جنسی مسائل کی جھلک اپنے ناولوں میں پیش کی ہے ۔اس حوالے سے ان کا ناول ''ٹیڑھی لکیر'' خاص اہمیت کا حامل ہے جس میں عورت کی نفسیات کے ارتقا کو پیش کیا گیا ہے ۔اس ناول میں ''شمن'' کا کردار بقول ڈاکٹر سید علی حیدر'' اپنے حالات کا ردِعمل ہے ۔جس میں وہ پیدائش سے لے کر جوانی تک گھری رہتی ہے ۔شمن صحیح معنوں میں متوسط طبقے کی بے شمار لڑکیوں کی زندگی ، حالات اور نفسیات کی آئینہ دار ہے ۔''اگر عصمت چغتائی کے ناولوں کا تجزیہ کیا جائے تو ان کے ہاں کوئی اور احساس سے محروم عورت کا تصور مفقود ہے ۔عصمت کے خیال میں عورت جو مرد کی خدمت کرتی ہے اور خاموش رہتی ہے ، اس کے اندر بھی احساسات کا طوفان موجود ہوا کرتا ہے ۔یوں عصمت کے ہاں اُبھرنے والا عورت کا تصور پہلے سے موجود اردو فکشن میں موجود نسوانی تصور سے خاصا مختلف بھی ہے اور منفرد

بھی۔عصمت چغتائی کے ناولوں پر ڈاکٹر وزیر آغا اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

''عصمت چغتائی کے بیشتر کرداروں کے پس منظر میں ایک ایسی عورت موجود ہے، جو گھر کی مشین میں محض ایک بے نام سا پرزہ بن کے نہیں رہ گئی بلکہ جس نے اپنے الگ وجود کا اعلان کرتے ہوئے ماحول کی سکہ بند قدروں اور رواجوں کو اگر منہدم نہیں کیا تو کم از کم لرزہ بر اندام ضرور کر دیا ہے۔''(۱۲)

مختصراً یہ کہا جائے کہ عصمت کا یہ کمال ہے کہ اُس نے اردو فکشن میں عورت کی جنسی نفسیات کو پہلی بار متعارف کروایا تو غلط نہ ہو گا۔جنسی نفسیات میں بھی خاص طور پر عورت کی ہم جنس پرستی کا جذبہ بڑی مہارت کے ساتھ عصمت کے ناولوں کا حصہ بنا ہے۔مزید براں اُنھوں نے عورت کی فطری کمزوریوں کو جس واشگاف انداز میں پیش کیا ہے وہ عصمت کا ہی کمال ہے۔بقول ڈاکٹر عقیلہ جاوید ''عصمت کے ناولوں کی عورت بیسویں صدی کی عورت ہے، جو اپنے دماغ سے سوچتی ہے، اپنے جذبوں کو محسوس کرتی ہے اور انھیں بیان کرنے پر قادر ہے۔''

آزادی سے قبل اُردو ناول کا ایک اَہم نام کرشن چندر بھی ہے۔جس نے ہندوؤں کے مہاجنی نظام کو بے نقاب کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس نظام میں عورت کو ایک انسان تصور کرنے کی بجائے جنس کا درجہ دے دیا گیا تھا۔عورت کے جسم کی فروخت، اس کے روح اور دل کی بربادی کرشن چندر کے ناولوں میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

اردو ادب میں جہاں ناول نے ڈپٹی نذیر احمد کے دور میں اپنی شناخت پیدا کی اور مختلف اور متنوع راستوں اور پگڈنڈیوں کا سفر طے کرتے ہوئے دورِ حاضر میں داخل ہوا ہے، وہاں اس صنفِ ادب نے طبقۂ اناث کی نمائندگی کو اپنے کینوس میں بھرپور جگہ دی۔ناول ''مراۃ العروس'' اور ''فسانۂ مبتلا'' سے لے کر ''خوابِ ہستی'' اور ''گئو دان'' کی منازل طے کرتا ہوا ''ٹیڑھی لکیر'' کی دنیا میں داخل ہوا ہے۔اس صنفِ ادب نے اپنے اپنے عہد کے رسم و رواج کے مطابق تصورِ عورت کو اجاگر کرنے کی شاعری کے برعکس منفرد کوشش کی ہے۔یہ صنفِ ادب رومانوی تحریک کی تخیل آفریں دنیا سے بھی رس کشید کرتی ہے اور ترقی پسند تحریک کی اشتراکی حقیقت نگاری سے بھی۔ہندو سماج میں عورت کے مسائل کی بات ہو یا مسلم سماج میں عورت کے حقوق کی، ناول نے اس کو اپنا موضوع بنایا ہے۔بیسویں صدی کے نصف اول سے قبل عورت فرسودہ رسوم و رواج کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔مردانہ معاشرے کی اقدار نے اسے اپنے تابع بنا لیا تھا۔عورت کی اہمیت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔بیسویں صدی میں ترقی پسندوں نے عورت کے مسائل کو معاشی نقطۂ نظر سے سامنے لانے کی کوشش کی۔انھوں نے اپنی تخلیقات میں اس بات پر زور دیا کہ کس طرح متوسط اور نچلے طبقے کی عورت معاشرتی دباؤ کے نتیجے میں نفسیاتی اور جنسی مسائل کا شکار ہے۔

بیسویں صدی میں صنعتی ترقی، سائنس، ٹیکنالوجی اور تجارت کے میدان میں انقلاب آفریں تبدیلیوں نے جہاں پوری دنیا کو متاثر کیا وہاں برصغیر پاک و ہند بھی اس سے اثر قبول کیے بغیر نہ رہ سکا۔اس کی مثال اردو ناول

میں پریم چند کا ''چوگانِ ہستی'' ہے، جس میں دیہاتی علاقوں سے شہری علاقوں میں نقل مکانی اور کاشت کاری کے خاتمے سے پرانے کلچر کے خاتمے کے مضمرات کا کرب بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح نت نئی تبدیلیوں نے برصغیر میں افکار کے جہانِ تازہ کی نمو کی اور نئے سے نئے نظریات منظرِ عام پر آنے لگے۔ اسی دور میں سگمنڈ فرائیڈ کے نظریات نے جملہ علوم کو اپنی گرفت میں لیا اور انسان کو ایسا حیاتیاتی قوعہ بنا کر پیش کیا جو اپنی جبلتوں کے ہاتھ میں صید زبوں سے زیادہ قدر نہیں رکھتا۔ اس بات سکی فکری نمائندگی عصمت چغتائی کے ناول ''ٹیڑھی لکیر'' میں بڑی خوش اُسلوبی سے ہوئی ہے۔ مزید براں ڈارون اور کارل مارکس کے خیالات کو بھی اردو ناول میں آسانی سے تلاشا جا سکتا ہے۔ تقسیمِ ہندوستان اور اس کے انسانی زندگی پر اثرات کے ہمرکاب عورتوں کا جس انداز میں استحصال ہوا، اس کی تصویر کشی بھی اردو ناول میں موجود ہے، جس کو ہر ناول نگار نے اپنے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔ آزادی سے قبل اردو ناول میں طبقہ اشرافیہ اور جاگیردارانہ معاشرت میں عورتوں کی زندگی کی تصویر کو بھی بیان کیا گیا ہے اور نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی خواتین کے مسائل اور نفسیات کی بھی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

حوالہ جات:

(۱) امین حنیف، **ہزاروں سال پہلے**، لاہور: مکتبہ کارواں، ۱۹۶۰ء، ص ۱۲

(۲) مودودی، ابوالاعلیٰ سید، **پردہ**، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۹

(۳) مبارک علی، ڈاکٹر، **تاریخ اور عورت**، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۶ء، ص ۳۴

(۴) شرافت حسین شفقت، سید، **عورت، مذہب اور حکومت**، لاہور: نسیم بک ڈپو، س۔ن، ص ۲۰

(۵) زینت بشیر، ڈاکٹر، **نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار**، حیدرآباد: الیاس ٹریڈرس، ۱۹۹۱ء، ص ۱

(۶) فہمیدہ کبیر، **اردو ناول میں عورت کا تصور**، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۹۲ء، ص ۳۶

(۷) عقیلہ جاوید، ڈاکٹر، **اردو ناول میں تانیثیت**، ملتان: شعبہ اردو بہاالدین یونی ورسٹی، جولائی ۲۰۱۵ء، ص ۱۱۸

(۸) محمد ہادی، رُسوا مرزا، **اُمراؤ جان اَدا**، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۱ء، ص ۲۴۰

(۹) راشد الخیری، مولانا، **صبح زندگی**، کراچی: عصمت بک ڈپو، ۱۹۳۹ء، ص ۳۷

(۱۰) راشد الخیری، مولانا، **صبح زندگی**، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۶۵

(۱۱) نیاز فتح پوری، علامہ، **شہاب کی سرگزشت**، لاہور: تعریف پرنٹرز، سن۔ندارد، ص ۱۸

(۱۲) وزیر آغا، **ساختیات اور سائنس**، لاہور: مکتبہ فکر و خیال، ۱۹۹۱ء، ص ۷۱